اس حسرت کے مضمون کو اپنی خواہشیں گن چکنے کے بعد اس بیان میں بھی دہرایا ہے کہ اگر حساب ہی لینا ہے تو گناہوں اور حسرتوں دونوں کا حساب لے۔ گناہ میرے ذمے اور خواہش پیدا کر کے اسے پورا نہ کرنے سے جو حسرت پیدا ہوئی وہ تیرے ذمے ایک پلڑے میں گناہ ڈالتا جا اور دوسرے میں نیکیاں جو شاید بہت کم وزن ہوں بلکہ حسرتیں ڈال کر پھر تول اور دیکھ کہ ہر جرم کے مقابلے میں ایک حسرت ہے یا نہیں بلکہ گمان غالب ہے کہ حسرتوں کی تعداد اور ان کا وزن زیادہ ہوگا اور گناہوں کا بوجھ مقابلتہً کم۔ تو عادل ہے اب خود ہی فیصلہ کر لے کہ ایسی حالت میں انصاف کا کیا تقاضا ہے۔ مجھ ایسے مظلوم سے گناہوں کی پرسش کرے گا تو رگِ دل کی کاوش سے خون کی ندیاں بہ نکلیں گی۔ ایسی حالت میں عذاب و گزند کے بجائے تلافی کا مستحق ہوں ؎

چو پرسش رگے را بکاود ز دل — دو صد دجلہ خونم تراود ز دل
بہر جرم کز روئے دفتر رسد — ز من حسرتے در برابر رسد
بفرمای کایں داوری چوں بود — کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہمچوں منے را بہ بند — تلافی فراخور بود نے گزند

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

ہم حسرتوں کو چھوڑتے ہیں تو پاداش سے قطع نظر کر۔ میں رندِ ناپارسا ضرور تھا۔ میرے فکر میں بھی ٹیڑھا پن تھا۔ ظاہر میں میں مسلمان دکھائی دیتا تھا لیکن طریقِ زندگی میں انداز گبرانہ تھا۔ پھر بھی تیری نازل کی ہوئی کتاب مقدس کو مانتا تھا اور تیرے انشور نبیؐ کا ہوا خواہ تھا۔ بہر حال کافر نہ تھا اس لیے رہائی کا حکم ہونا چاہیے ؎

کہ البتہ ایں رندِ ناپارسا
کج اندیشۂ گبرِ مسلماں نما

SALEEM LIBRARY
1/8 Shar ...wala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.



# طوفانِ آرزو

اکثر حکما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی بلکہ ساری ہستی آرزو کی پیداوار ہے مہاتما بدھ نے حبِ النفس و آفاق کی زندگی اور وجود کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور نفس کی گہرائیوں میں غوطے لگائے تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ساری کائنات مصائب سے لبریز ہے۔ اخلاقیات اور مذاہب میں علامات کا علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ لیکن علّتِ مرض کی بیخ کنی نہیں ہوتی۔ ہر علاج محض سرسری اور ہنگامی ہوتا ہے۔ آرزو پوری نہ ہو تو انسان مایوس اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اور پوری ہو جائے تو عین کامیابی کے لمحے میں اس کی لذت جاتی رہتی ہے۔ نفس کے ہاتھ میں خاکستر کی ایک مٹھی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایک آرزو پوری ہوتے ہی دوسری آرزوؤں کو جنم دیتی ہے پھر وہی ہوس، وہی اضطراب اور وہی جد و جہد شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قدرت کے کارخانے میں کہیں سکون نہیں۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔ زندگی دانتوں کے درد سے مشابہ ہے۔ اور دانتوں کی بیماری میں یہی نسخہ مجرّب ہے کہ علاجِ دنداں اخراجِ دنداں۔ ساری زندگی جڑ سے اکھاڑ دینی چاہیے۔ زندگی کی بیخ آرزو ہے، لہٰذا آرزوؤں کا قلع قمع ہونا چاہیے اسی فلسفہ حیات نے ہر جگہ فرار اور گریز کی تلقین کی اور اسی سے شرق و غرب میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ ابتدائی عیسائیت بھی رہبانیت تھی۔ اور بدھ مت بھی اصل میں رہبانیت ہی کی تعلیم دیتا تھا۔ عام ہندو فلسفہ بھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کسی قسم کے اعمال سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اصل نجات زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام ہے۔ ہر عمل نیک ہو یا بد لازماً اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور آواگون میں یہ نتیجہ نئے جنم پر نئے روپ سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ازلی اور لا متناہی ہے۔ طریقِ نجات فقط یہی ہے کہ گیان سے آدمی

اس چکر میں سے نکل جائے۔ نفس میں انفرادیت اور خودی بھی تمناؤں اور اعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تمنائیں اور اعمال نہ رہیں گے تو خودی بھی سوخت ہو جائے گی اور بس۔ ایک بزرگ بے صفات و تعینات حقیقت رہ جائے گی۔ کائنات انسانی مع نفوس مایا ہی مایا یا سیمیا ہے۔ فقط گیان سے یہ فریبِ ادراک دور ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں میں تصوف کے راستے سے اس قسم کے نظریات دخل پا گئے تھے۔ بیدل میں اس قسم کا ویدانتی تصوف جا بجا ملتا ہے ؎

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما

یہ امر بحث طلب ہے کہ یہ غیر اسلامی زاویۂ نگاہ جو ہستی کو باطل اور نفسِ انسانی کو دھوکا قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں میں غیر اسلامی راستوں سے آیا یا جس قسم کے حالات اور نفسیات نے یہ زاویۂ نگاہ اور اقوام میں پیدا کیا تھا۔ اسی کے مماثل تاریخ کی منطق نے ان میں بھی اس قسم کے افکار پیدا کیے۔ یہ افکار غالب میں بھی ملتے ہیں۔ اس کے اردو اور فارسی کلام میں کثرت سے اشعار ملتے ہیں۔ جو یہی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ دیکھیے بدھ مت والا اور ویدانتی اس سے زیادہ کیا کہے گا ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن ان ادیان میں یہ ہے کہ موت سے بھی نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ذوقؔ کے سارے کلام میں غالبؔ کو یہی ایک شعر پسند آیا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے



یہ کہ خودی کا مطلقاً صفایا ہونا چاہیے۔ سب سے بڑا بُت انسان کا اپنا وجود ہے۔ جب تک اس بُت کو پاش پاش نہ کیا جائے مقصودِ حیات حاصل نہیں ہو سکتا ؎

گو لاکھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

لیکن غالبؔ اپنی طبیعت کا تقاضا دفع نہ کر سکا۔ نظریاتی لحاظ سے وہ وحدتِ وجود کا قائل ہے اور ساری ہستی کو خواب کو خیال کہتا ہے۔ خواہ وہ خدا ہی کا خواب و خیال ہو ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ایک اور فارسی شاعر بھی اسی انداز میں ساری ہستی کو انسانی نفوس کے ساتھ خدا کا خواب کہتا ہے۔ جب تک خدا یہ خواب دیکھ رہا ہے ہم بھی موجود معلوم ہوتے ہیں اور سارا عالم صُور و مظاہر بھی ہست دکھائی دیتا ہے۔ اگر خدا بیدار ہو جائے اور ازلی نیند سے چونک پڑے تو نہ کائنات رہے نہ ہم ؎

تا تو ہستی خدائے در خواب است — تو نہ مانی چو او شود بیدار

(معلوم نہیں کس کا شعر ہے۔ راقم الحروف نے علامہ اقبالؔ سے سنا تھا)

غالبؔ کے کلام میں کچھ نظریات ہیں، کچھ ذاتی میلانات، جذبات اور تاثرات۔ ہستی کو نمودِ بے بود کہنا زیادہ تر ایک عقلی نظریہ ہے۔ لیکن شاعر کا سرمایہ عقلی نظریات نہیں بلکہ تاثرات اور جذبات ہوتے ہیں۔ خود ان سے بھی نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص اپنے میلانات اور طبیعت پر چھائے ہوئے جذبات کو مطلقاً نامعقول نہیں سمجھتا، اور کسی نہ کسی طرح انھیں بھی عقائد، اصول اور معقولات کے تخت میں لانا چاہتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ غالبؔ نے غم و اندوہ کی کیفیت نفسی میں سے کیا کیا نکات پیدا کیے ہیں۔ اسی طرح وحدتِ وجود جس کا غالبؔ دلدادہ ہے ایک عقلی نظریہ

ہے۔ تاثرات کے عالم میں یہ وحدت ایک قسم کی دوئی میں منقسم ہوجاتی ہے۔ مناجات میں کہنے والا حاضر اور سننے والا سمیع و علیم ایک نہیں رہ سکتے۔ غالب کے اپنے تاثرات اور جذبات میں سے جو فلسفہ پیدا ہوتا ہے وہ اس فلسفے سے الگ ہے جو محض عقلی نظریات کی پیداوار ہو۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

یہ شعر نظریاتی ہے اور اس شاعر کا ہے جو دوسری جگہ ہدایت کرتا ہے کہ کبھی انجمنِ آرزو سے باہر قدم نہ رکھنا چاہیے۔ شراب اگر نہ ملے تو اس کی آرزو اور انتظار ہی سہی حقیقت یہ ہے کہ غالب آرزوؤں کا بندہ ہے اور اس کی آرزوئیں اسفل سے اعلیٰ تک اپنے اندر ایک بوقلمونی رکھتی ہیں۔ زیادہ تر لذت طلبی، رنگینی اور رندی کی خواہشیں ملیں گی۔ لیکن کہیں کہیں اوپر اٹھتی ہوئی ولایت کا دامن چھو آئیں گی۔ قطعہ ۱۴ میں فتح الملک کے قصیدے میں اپنی آرزوئیں بیان کرتا ہے۔ جو ہوس سے بلند تر نہیں ہوتیں۔ مال کا آرزومند ہے تاکہ شراب و کباب فراغت سے حاصل ہوں۔ اور غزل و قصیدہ کے لیے فرصت میسر ہو لیکن ساتھ ہی یہ آرزو بھی لگی ہوئی ہے کہ اسرارِ ازل کی گرہ کشائی بھی کروں اور عقلِ فعّال کے فیضان سے بہرہ اندوز ہوں۔ چند اشعار میں اپنی خواہشوں کی پوری فہرست پیش کردی ہے ؎

از تو گیرم بگدائی زر و پاشم برِ خلق
گوئی از جود تو آموختہ ام بذل و نوال

کہتا ہے کہ میں مال کو مال کی خاطر نہیں چاہتا یہ تو احمقوں اور بخیلوں کا شیوہ ہے۔ ایک طرف اس سے اپنی تشنگی رفع کرنا چاہتا ہوں اور دوسری طرف بذل و نوال اور سخاوت کا آرزومند ہوں۔ مال مقصود نہیں۔ اپنی اور دوسروں کی پیاس بجھانے اور



ضروریات کے رفع کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر غیب کے خزانے بھی میرے ہاتھ آجائیں اور میری پیاس رفع نہ ہو تو اس سے کیا فائدہ۔ بادۂ ناب میسر نہ آئے تو پرویز کے سات خزانے دو جو کے برابر قیمت نہیں رکھتے۔ باغ میں کنجِ عافیت مل جائے یا اعتبار سے دروازہ بند کرکے اطمینان سے گھر میں خلوت گزیں ہوں۔ نہ فرش پر خس و خاشاک ہوں اور نہ دل میں گردِ ملال۔ اس گوشۂ عافیت میں کبھی بے خودی طاری ہو اور کبھی ہوشیاری کا غلبہ ہو۔ کبھی غزل لکھوں اور کبھی قصیدہ انشا کروں۔ لیکن فطرت کا تقاضا اسی پر ختم نہیں ہوجاتا۔ اسرارِ ازل کا بھی جویا ہوں حکمت پسند بھی ہوں۔ دن تو چمن میں سخن آرائی اور نکتہ سنجی سے گزارنا چاہتا ہوں۔ اور رات کو عقل کی شمع سامنے رکھ کر حکمت سے نور حاصل کرنا چاہتا ہوں ؎

از تو گیرم بگدائی زر و پاشم برِ خلق — گوئی از جود تو آموختہ ام بذل و نوال
فی المثل گر بودم دست بگنجینۂ غیب — چوں شوم تشنہ بجشم بہ دمے آبِ زلال
ہفت گنجینۂ پرویز نہ سنجم بہ دو جو — تشنۂ بادۂ نابم نہ گدا پیشۂ مال
آنچہ می خواہم ازیں تو طلبیہ دانی چیہ بود — کنجے از باغ و خمے از مے و جائے سفال
بستہ بر غیر در کلبہ و بر نظم طراز — رفتہ از زاویہ خاشاک و ز دل گردِ ملال
گہ دراں گوشہ ز خود رفتہ و گاہی ہشیار — گہ دراندیشۂ غزل سنج و گہے مدح سگال
گہ ز اسرارِ ازل یافتہ در سینہ نشاں — گہ ز آثارِ خرد ریختہ بر صفحہ لآل
تا بود روز بر سو کہ فتد سایہ بخاک — جاگزینم بکنارِ چمن و پائے نہال

چوں شود شام نہم شمعِ فروزندہ پیش
از درخشندگیٔ جوہرِ عقلِ فعّال

حافظ شیرازی کے ہاں بھی اسی قسم کی خواہشیں ملتی ہیں اور وہ ان خواہشوں کو

اپنے تصوّف کے منافی نہیں سمجھتا ؎

؎ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے — دو یارِ زیرک و از بادۂ کہن دو منے

---

؎ دو سالہ و محبوبِ چاردہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

نظری لحاظ سے غالبؔ ہستی کو نیستی کے برابر سمجھتا ہے۔ لیکن جب اس کا تاثر لب کشائی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اگر محرمئ ذات نہ ہو تو بھی لطفِ صفات کیا کم ہے۔ بہار کو اگر قرار نہیں تو بھی اس سے رُوگردانی کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ معشوق کے دل میں عاشق سے اُلفت نہیں تو بھی خود عشق ایک دلچسپ کیفیت ہے خواہ اس سے کوئی اور مقصود حاصل نہ ہو۔ ہستی کی بے ثباتی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہنگامی طور پر بھی اس سے لطف نہ اٹھایا جائے ؎

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبئ ہوا کہیے

اقبالؔ نے بھی اسرارِ خودی میں اپنا فلسفۂ آرزو بیان کیا ہے۔ خودی کا قیام آرزو کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ شعاعِ آرزو نہ ہو تو زندگی کی شمع بجھ کر رہ جائے ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اسی ضمن میں اقبالؔ اپنے فلسفۂ ارتقا میں کہتا ہے کہ آرزو ہی حیات آفریں ہے۔ جسم سے آرزو پیدا نہیں ہوتی بلکہ جسم اور اس کے اعضا خود آرزو کی تشفی کے آلات و ذرائع ہیں ؎

کبک پا از شوخئ رفتار یافت — بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

یہ وہ مضمون ہے جسے عارفِ رومیؒ نے مثنوی کے ایک شعر میں بیان کیا ہے



کہ قالبِ انسانی نفسِ انسانی کی تمنّاؤں کی پیداوار ہے۔ اور اشیا میں جو صفات محسوس ہوتے ہیں وہ بھی آرزوئے نفس کی پیداوار ہیں ؎

قالب از ما ہست شد نے ما ازو
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

زندگی میں آرزوؤں کی تنظیم اور توسیع ہونی چاہیے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگئ داماں بھی ہے

غالبؔ بھی کہتا ہے کہ قناعت کوئی علاج نہیں۔ بلکہ تنگئ دامن کو رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں غالبؔ نے ایک لطیف حکیمانہ اور صوفیانہ نکتہ بیان کیا ہے کہتا ہے کہ انسان کو آرزوئیں جذبۂ ملکیت کی وجہ سے پریشان کرتی ہیں۔ اگر قلب میں یہ وسعت پیدا کر لی جائے کہ جو نعمتیں دنیا میں موجود ہیں ان پر قابض ہوئے بغیر ان سے لطف اٹھایا جائے تو آرزوئیں پوری بھی ہوں اور ان کی کشاکش بھی رفع ہو جائے ادنیٰ درجے کی حریص طبیعتیں کسی باغ سے اسی حالت میں پورا لطف اٹھا سکتی ہیں جب قانوناً وہ اس پر قابض ہوں۔ جس شخص میں ذوقِ جمال کا فقدان ہے وہ پھولوں کو سرِ شاخ دیکھ کر ان سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ حسنِ گل دیکھ کر اس کی طبیعت گلچینی پر مائل ہوتی ہے خواہ پھول کی رگِ حیات کٹ جائے لیکن وہ دامن میں ڈال لیا جائے یا اس سے کلاہ و دستار کی آرائش کی جائے۔ یہاں اقبالؔ کی ایک رباعی یاد آگئی ؎

گل گفت کہ بادِ نو بہارے خوشتر — یک صبحِ چمن ز روزگارے خوشتر
زاں پیش کہ کس ترا بدستار زند — مُردن بہ کنار شاخسارے خوشتر

غالبؔ کہتا ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور حسن و جمال پر قابض ہونے کے بجائے نفس میں یہ وسعت کیوں نہ پیدا کر لی جائے کہ ساری کائنات براہِ ذوق و شعور انسان کے

دامن میں آجائے ۔

ہر چہ در مبدءِ فیاض بود آنِ من است
گل جدا نا شدہ از شاخ بداماںِ من است

اس شعر میں فکر و وجدان کی معراج دکھائی دیتی ہے۔ کائنات پر انسانی نفس کا قبضہ عقل و وجدان کی بدولت ہوتا ہے۔ علمائے فلکیات علم سے اجرامِ فلکیہ کو مسخر کیے بیٹھے ہیں، نبی اور ولی کے پاس کسی جائداد کا قبالہ نہیں ہوتا لیکن اس کا نفس افلاک سے وسیع تر ہوتا ہے اور کونین اس کے ایک گوشے میں سما جاتے ہیں۔ اس مضمون کی ایک لاجواب رباعی سرمدؔ کی ہے عام عقیدہ یہ ہے کہ نبی اکرمؐ حضرت محمد مصطفیٰؐ کو خدا تک پہنچنے کے لیے افلاک کی مسافت طے کرنی پڑی اگرچہ مکانِ لامحدود و زمانِ یک لحظہ میں طے ہو گیا لیکن بہرحال اُنھیں مع جسم افلاک سے گزرنا پڑا۔ بعض صحابہ کرامؓ بھی جسمانی معراج کے قائل نہ تھے لیکن یہاں یہ بحث و تحقیق مقصود نہیں۔ فقط سرمدؔ کا عقیدہ اس بارے میں بیان کیا جاتا ہے جو اپنی حکمت اور لطافت میں وجد انگیز ہے ۔

آں را کہ سرِ حقیقتش باور شد — خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمدؐ بہ فلک — سرمدؔ گوید فلک بہ احمدؐ در شد

رازِ حیات سے آگاہ ہونے کے بعد نفس افلاک سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ملا کہتا ہے کہ حضرت احمد مجتبیٰؐ سفر کر کے افلاک پر پہنچے لیکن سرمدؔ کہتا ہے کہ یوں نہیں ہوا بلکہ افلاک اس بے کنار نفس میں سما گئے۔

غالبؔ کے ہاں یہ کشاکش آخر تک چلی جاتی ہے کہ ایک طرف ہوس دامن گیر ہے اور دوسری طرف دنیا کی آرزوؤں کو سراب سمجھنے کا میلان ہے۔ اس تضاد کے نمونے اس کے اردو اور فارسی کلیات میں جا بجا ملتے ہیں ۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا



ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مثنوی رنگ و بو میں اپنی ہوس پرستی کا بہت ماتم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ افسوس ہوسِ جاہ نے تجھے قعرِ مذلت میں گرا دیا ہے۔ بندۂ زر ہونا شیطان کی پیروی کرنا ہے۔ تجھ میں جتنی گرمیٔ خون اور جوشِ حیات تھا اُسے تو نے تعمیرِ سیرت کے بجائے تخریبِ کردار میں صرف کیا۔ ہوس پرستی کے جنون میں تیری زندگی زُلفِ بتاں کی طرح تار تار ہو گئی۔ دنیا طلبی کے دھوکوں میں پڑ کر خود اپنی نظروں سے گر گیا ہے

در ہوسِ جاہ فرو رفتہٴ — حیف کہ در چاہ فرو رفتہٴ
تا پئے نیرنگِ وفن افتادہٴ — از نظرِ خویشتن افتادہٴ
بندۂ زر بودن از آہرمنیست — مرد خدا ایں چہ خدا دشمنیست
آہ ز دنیا طلبی ہائے تو — ویں ہمہ ابرام و تقاضائے تو
گرمیٔ خونت کہ ازیں بیش بود — صرفِ برانداختنِ خویش بود

بود چو پیچ و خمِ سودائے کار
کارِ تو چوں زلفِ بتاں تار تار

یہ ساری ہوس پرستی دیوانگی اور جہالت تھی جس کا لازمی نتیجہ ناکامی ہوتا ہے اور اس تگ و دو سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پیرویٔ ہوس ایک مہلک مرض ہے۔ اول تو دنیا میں انسان کی حرص کبھی پوری نہیں ہوتی۔ دنیا طلب کی آنکھوں کو یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور۔ لیکن فرض کرو کہ کچھ آرزوئیں پوری بھی ہو گئیں تو بھی حقیقت کی آنکھ کھلنے پر معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ نقش و نگارِ پرِ عنقا ہی تھا

(یہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا)

۵ آں ہمہ دیوانگی و جاہلی — واں ہمہ ناکامی و بے حاصلی
آں ہمہ بدمستی و تن پروری — واں ہمہ شیادی و افسونگری
آں ہمہ بیراہہ روی ہائے تو — واں ہمہ بے صرفہ دویہائے تو
آں ہمہ خوں بودہ و خاک است ایں — آں مرضے بود و ہلاک است ایں
آں چہ روش ایں چہ پسیچ است ہائے — آں ہمہ پوچ ایں ہمہ ہیچ است ہائے
نیمہ شب از عمر تو در خواب رفت — نیمہ بہ بیہودنِ مہتاب رفت
بیں کہ دریں کارگہِ پیچ پیچ — ماحصلِ سعی تو ہیچ است ہیچ
نقدِ تمنّا بکف افتادہ گیر — خسروئی دست بہم دادہ گیر
اے ہمہ تن وسوسہ سودِ تو کو — دہر سراب است وجودِ تو کو
ہرچہ ازیں پردہ ہویداستے — نقش و نگارِ پرِ عنقاستے
ہستیٔ اشیا کہ غبارِ فنا ست — پردہ کشائے اثرِ سیمیا ست

خلق کہ از وہم نمودیش ہست
وہم تو وانست کہ بودیش ہست

---

قصیدہ سوم نعت میں رندی اور ہوس پرستی کے زمانے کا ذکر کرتا ہے شوق و ذوقِ بوس و کنار، فکر کی گل افشانی قلم کی گلزار آفرینی بساطِ زندگی کا تانا بانا رنگ و بو سے بنا ہؤا وقت میں کوثر کی روانی بزم میں طراوتِ فردوس، مطرب کا ساز، ساقی کا ناز مسلسل مستی و سرور، شاعری شراب، شاہد بازی، قمار بازی، کیسے سے خصومت اور کاسے سے لجاجت، راتوں کی بدمستی اور صبح کی نیند، غرض رندی و رنگینی، لذّتِ جمال و کمال سبھی کچھ حاصل تھا لیکن آخر سب کچھ حرمان میں بدل گیا۔ اب رگوں میں اتنا خون بھی نہیں کہ خون کے آنسو رو سکوں۔ اب نامۂ اعمال اور دفترِ سخن میں کوئی نقش و تحریر نہیں



فقط داغ ہی داغ ہیں اور میرے جامے میں میرے اپنے تنِ نزار کے سوا کوئی تار نہیں

شوقم جریدۂ رقمِ آرزوئے بوس — ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار
فکرم بجیبِ شاہدِ اندیشہ گل فشاں — کلکم بطرفِ گلشنِ نظارہ لالہ کار
از چشم و دل نہاد مرا بود تاج و تخت — وز رنگ و بو بساطِ مرا بود پود و تار
وقتِ مرا روانیٔ کوثر در آستیں — بزمِ مرا طراوتِ فردوس در کنار
ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سور — پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار
با کیسہ در خصومت و با کاسہ در لجاج — رندانِ پاکباز و تنگر زانِ نشاد خوار
بدمستیٔ شبینہ و خوابِ سحرگہی — رنگینیٔ سفینہ و اشعارِ آبدار
اکنوں منم کہ رنگ بر ویم نمی رسد — تا رُخ بخونِ دیدہ بشویم ہزار بار

نقشم بہ نامہ نیست بجز سرنوشتِ داغ
تارم بجامہ نیست بغیر از تنِ نزار

اپنے کردار ناہنجار کے متعلق اب میری آنکھیں کھلی ہیں لیکن اپنی قوتوں کو بے راہہ روی میں ضائع کر چکنے کے باعث ماضی سے شرمسار اور مستقبل سے ناامید ہو گیا ہوں

چشمم کشودہ اند بکردارہائے من — زانگندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

قصیدۂ چہارم نعت و منقبت میں کہتا ہے کہ عمرِ عزیز کے چالیس سال ہو چکے ہیں۔ سرمایۂ حیات لہو و لعب میں کھو چکا ہوں، اور ایمان و عمل کی جو حالت ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ اب زندگی کی شام قریب ہے۔ قافلۂ حیات بہت دور نکل گیا ہے۔ میں غم و اندوہ اور ناتوانی سے سست رفتار ہوں، خدا کا طاعت گزار نہ ہونے پر بھی وہ کریم مجھے رزق دیے جاتا ہے۔ اس سے مجھے ایسی شرم آتی ہے کہ پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ ابھی تک معشوقوں کے جلوے کی پوجا کرتا ہوں اور کیشِ مغاں یعنی شراب نوشی ترک نہیں کی۔ روزوں

کے متعلق یہ خبر تک نہیں ہوتی کہ اب شوال ہے یا رمضان اور یہ معلوم نہیں کہ سجدہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ میری فطرت ذوقِ سجدہ سے لبریز ہے تو بھی پیشانی میں سجدے کی کوئی نشانی نہیں ؎

از عمر چہل سالہ بہنگامہ سر آمد　　سرمایہ بہ بازیچہ تلف گشت دکان را
روز آخر و من سست پے و قافلہ بس دور　　در باختہ ام از غمِ رہ تاب و توان را
زیں روے کہ طاعت نکنم لیک خداوند　　از من نبرد مایۂ آرائشِ خوان را
ہر گہ کہ خورم نان تنم از شرم گدازد　　چندانکہ ز خویش آب کشم وسمت دہان را
در جلوہ پرستم رخ و گیسوئے صنم را　　در شیوہ پسندم روش و کیشِ مغان را
در قاعدۂ سجدہ سر از پا نشناسم　　در روزہ ز شوال ندانم رمضان را

گیرم کہ نہادم بود از سجدہ لبالب
اے وائے گر از ناصیہ جویند نشاں را

غالب کے نزدیک زندگی کا سرچشمہ عشق یا شوق ہے۔ شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے، لیکن عشق غلط انگاری اور غلط روی سے ہوس اور پروانۂ دلِ مگس بن جاتا ہے۔ زندگی کا سارا کاروبار تمنّا اور شوق کی بدولت ہے۔ مے و نغمہ اگر حرام بھی ہوں تو بھی شوق اس طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ لیکن یہی شوق اگر نشۂ توحید میں تبدیل ہو جائے تو دار پر پایۂ منصور کو بلند کرتا ہے۔ فرہاد کے رگ و پے میں سرایت کرتا ہے تو وہ سختی سے مرنے پر تیار ہوتا ہے۔ اور قیس بادیہ پیمائی کو کوئی ناقابلِ برداشت مصیبت نہیں سمجھتا۔ شوق ہی نے میری طبیعت کے آئینے کو بھی جلا دی ہے شوق ہی نے مجھے سخن سنج بنایا ہے۔ لیکن جس شوق کا میں ذکر کر رہا ہوں جو حسن و عشق اور سخن کا پروردگار ہے۔ اس کی کیفیت آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتی وہ ایک راز ہے جس پر بحث و جدل

SALEEM LIBRARY
I/S Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan Lahore



کی گنجائش نہیں، لہٰذا اس کی حقیقت کے متعلق میں ہرگز کسی سے جھگڑا نہیں کرتا۔ میرا ساز سوزِ دل کا ہے۔ اس کی آواز میں شکایت کا شائبہ تک نہیں۔

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرامست　　دیدیم و شنیدیم سمعنا و اطعنا
با ایں ہمہ ہر جا کند آہنگِ خرابی　　سرگرمیٔ شوقے کہ بود حوصلہ فرسا
با نغمۂ مطرب نتواں شد متعصب　　از جلوۂ ساقی نتواں کرد تبرّا
شوقست کہ چوں نشاۂ توحید رساند　　از دار بر د پایۂ منصور ببالا
شوقست کہ فرہاد از و مردہ بہ سختی　　شوقست کہ مجنون شد از و بادیہ پیما
شوقست کہ مرآۃ مرا دادہ بہ صیقل　　شوقست کز و طوطیٔ طبعم شدہ گویا

شوقم ہمہ راز است من و عربدہ ہرگز
سوزم ہمہ ساز است من و شکوہ مبادا

آرزوؤں کے طوفان اور زندگی میں ان کے پورا نہ ہونے کی شکایت غالب نے جا بجا کی ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ زندگی کا ایک ہی رُخ اور اسے دیکھنے اور برتنے کا ایک ہی انداز نہیں۔ زندگی کے ہزار پہلو ہیں۔ رجائیت اور قنوطیت بظاہر دونوں کا سامان موجود ہے۔ ذوق بھی کہتا ہے کہ دنیا کی منڈی میں ہر قسم کی جنس پہلو بہ پہلو رکھی ہے۔ لیکن (ع) میٹھے کو یہ میٹھی ہے اور کھٹّے کو ہے کھٹّی۔ غالب خدا کی رحمت اور مبداء فیاض کے فیضان کا منکر نہیں۔ اس کی شکایت اسی قسم کی ہے جو بچہ ماں باپ سے کرتا ہے۔ نافہمی کی وجہ سے اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ والدین خواہ مخواہ مجھے روک ٹوک کرتے ہیں اور میری تمام خواہشیں پوری نہیں کرتے۔ لیکن بچہ بھی اپنے تحت الشعور میں ماں باپ کی رحمت اور محبت کا منکر نہیں ہوتا۔ جب اس کی عقل پختہ ہوتی ہے تو خود بخود سمجھنے لگتا ہے کہ میری ہر خواہش کو پورا نہ کرنا میری بھلائی کے لیے تھا۔ ورنہ ماں باپ میں بخل نہ تھا۔ چنانچہ غالب جب اس نگاہِ حقیقت رس سے زندگی کو دیکھتا ہے۔ تو

زمانے اور فطرت کو بُرا کہنے کے بجائے اس کے اندازِ عمل کی حمایت کرنے لگتا ہے
قصیدہ دوازدہم در منقبتِ امامِ دوازدہم کی تشبیب میں کہتا ہے کہ آئینِ دہر میں
کسی کو نقصان پہنچانے کا میلان نہیں۔ ہما جیسے طائرِ لاہوتی کو جس کے سائے سے انسان
خوش بخت ہو جاتے ہیں۔ ہڈیاں بطورِ غذا ملتی ہیں۔ یہ ہما کی قدر ناشناسی یا توہین
نہیں۔ غذا اس کی فطرت کے مطابق ہی مناسب ہوگی۔ گلزار میں اگر کسی درخت کو ثمر
نہیں عطا ہوتا تو اس میں برگ و شگوفہ کی بہار ہوتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہر نخل کو ثمر
ہی عطا ہو۔ درویش کو روٹی کم ملتی ہے لیکن ملتی تو ہے۔ شاید کم خوری ہی اس کے
تزکیۂ نفس کے لیے لازم ہے۔ کسی کے نہاں خانۂ ضمیر اور دل و دماغ میں خزینۂ سخن
رکھ کر اس کی کنجی مال و جاہ کے نقصان کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ کیا اس لیے کہ ایک
عمدہ چیز عطا کر دی ہے۔ لہٰذا نفع و نقصان برابر کرنے کی غرض سے دوسری چیز چھین
لی جائے؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ زمانہ اس کی قوتیں منتشر نہیں کرنا چاہتا۔ مالی اور جسمانی
نقصان و حرمان سے اچھے انسان کی توجہ زندگی کے اعلیٰ اور حقیقی اقدار کی طرف منعطف
ہوتی ہے۔ زیادتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے۔ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور (غالب)
اپنا اور دوسرے کا حرمان دیکھ کر طبیعت میں درد اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے
اور چشمِ پُرنم میں وہ بصیرت پیدا ہوتی ہے جو چشمِ بے نم کو میسّر نہیں۔ عرفی نے بھی اسی
حقیقت کو حمد کے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

غالبؔ کہتا ہے کہ بے صبری اور نافہمی سے انسان نعمتوں کی ناپائیداری اور
رنگِ زمانہ کی نیرنگی کا رونا روتا ہے۔ یہ حماقت کی بات ہے۔ انسان کی فطرت بہار
سے اس لیے لطف اٹھاتی ہے کہ وہ خزاں کی بے برگی سے آشنا ہو چکی ہے۔ اگر



زندگی کے ہر مظہر میں ثباتِ دوام ہو تو تنوّع اور گوناگونی ختم ہو جائے۔ ثباتِ بے تغیّر
سے انسان گھبرا جائے، خواہ وہ کسی اچھی ہی کیفیت کا ثبات ہو۔ شباب کے اضطراب
سے گھبرا کر انسان بچپن کی معصومی اور بے فکری کے اعادے کی تمنّا کرنے لگتا
ہے۔ کسی کا شعر ہے ؎

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

اور علّامہ اقبالؔ طفولیّت کی یاد میں کہتے ہیں ؎

ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

ایسی لہریں یونہی سطحِ نفس پر اٹھتی ہیں، ورنہ کون شخص حقیقت میں بچپن کی طرف عود کر کے ہمیشہ کے لیے بچہ بننا قبول کرے گا۔ اگر مجھ ایسا شاعر بذلِ مال کی دسترس نہیں رکھتا تو اس کے بدلے میں اس کے پاس سخن کا گنجِ فراواں اور عقلِ نکتہ رس موجود ہے جو وہ دوسروں پر نچھاور کر سکتا ہے۔ مال کے مقابلے میں کمال کیا کم دولت ہے۔ انسان کی ناشکری ہے کہ جو کچھ میسّر ہے اس کا شکر گزار نہیں ہوتا، اور جو میسّر نہیں اس کے فقدان سے ملول ہوتا ہے۔ زمانے میں وہ کون شخص ہے جسے کچھ نہ ملا ہو لیکن جھونپڑوں والے محلوں کے خواب دیکھتے ہیں، اور محلوں والے عشرت و مصائب سے دل باختہ ہو کر اہلِ کاشانہ پر رشک کرنے لگتے اور آرزو کرتے ہیں کہ دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو، جس میں راتوں کو ایک ٹوٹا ہوا دیا جلے۔

؎ ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد — آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد
ہر دست مزد ہر چہ کند بے خطر کند — رادست راد ہر چہ دہد رائگاں دہد
گلزار را اگر نہ ثمر گُل بہم نہد — درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گنج سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر      وانگہ کلیدِ گنج بہ دست زباں دہد

داگر زیاں کی جگہ زبان ہو تو مضمون بدل جاتا ہے لیکن بات صحیح رہتی ہے مطبوعہ نسخے میں زیاں ہی ہے)

تا آدمی ملال نہ گیرد زیک ہوا      سرما و نو بہار و تموز و خزاں دہد
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن      تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق      تا آرزوئے کام و مرادِ دہاں دہد
آں راکہ بختِ دسترس بذل مال نیست      طبعِ سخن رس و خردِ خردہ داں دہد

آں راکہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل زخامۂ پروین نشاں دہد

کہتا ہے کہ زمانے کی یہ فیض رسانی اس کا ثبوت ہے کہ قادر مقدرت او قسامِ ازل عادل و رحیم ہے ظالم و بیداد گر نہیں۔ پرویز دیریابی سے گھبرا جاتا ہے اور فرہاد بے صبری سے سر پر تیشہ مار کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اگر وہ فطرت کے امتحان کا راز سمجھتے تو ایسا نہ کرتے۔ دنیا میں ہر چیز کا علاج موجود ہے۔ اگر مریض پزشک (طبیب) کی ہدایت پر کان نہ دھرے اور مر جائے تو اس میں طبیب کا کیا قصور ہے؎

دانم کہ آسماں بہ زمیں پیش کار کیست      عکسِ چہ جلوہ روشنی روشناں دہد
چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داور است      بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد
رنگ از گل است و سایہ زنخل و نوا ز مرغ      ہر جا بہار ہر چہ بود در خور آں دہد
در نشرِ نغمہ قرعہ بنام ہوا زند      در نشوِ سبزہ حکم بآبِ رواں دہد
ہر صبح بادِ صبح بمرغانِ شاخسار      سرمستیٔ شمیم و نشاطِ فغاں دہد
دارو نہ بہرِ زندگی آمد نہ بہر مرگ      جرمِ پزشک چیست اگر خستہ جاں دہد
پرویز دیریاب شمے بود و دہ نہ بخت      آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد



فرہاد زود میر کسے بود ورنہ دہر      کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد

اس مضمون کو کہ دنیا امتحان گاہ ہے غالبؔ نے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا نے کعبے کو کسی زرخیز اور سرسبز جگہ نہیں رکھا بلکہ اس کا مقام ایسا بنایا ہے کہ اس کے گرد و پیش دور دور تک صحرا ہی صحرا ہے۔ خدا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ بے آب و گیاہ بیابان طے اور اپنی عقیدت و ہمت کا ثبوت فراہم کر کے کون یہاں پہنچتا ہے۔ پانی کی تشنگی سے وہ روح کی تشنگی جانچنا چاہتا ہے؎

عیار کعبہ رواں تا نہ تشنگی گیرند
نداوہ اند در آں دشت راہ دریا را

زندگی کی شمشیر نقصان و حرمان کے سنگِ فساں پر تیز کی جاتی ہے۔ ایام کی گردش اور اس کی رگڑ سان کے پتھر کی طرح ہے۔ تیزیٔ فکر اور تعمیرِ سیرت اسی کی رہینِ منت ہے؎

تیزیٔ فکرِ من از تست زگردوں چہ خطر
سختیٔ دہر شود تیغِ مرا سنگِ فساں

---

اگرچہ یاس کے مضامین غالبؔ میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا سارا کلام نظرِ امعان سے دیکھا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ غالبؔ مصائب سے مغلوب نہیں ہوتا۔ نقصان میں سے نفع کا پہلو تلاش کرنا اور ہر شر میں خیر کی جھلک دیکھنا اسی شخص کا کام ہے جو زندگی کو سراپا زحمت سمجھ کر اس سے گریز کے راستے تلاش نہیں کرتا۔ اُس کے فلسفۂ غم میں بہی کثرت سے اس کا ثبوت مل چکا ہے کہ وہ غم کو دل افروز اور بصیرت افزا سمجھتا ہے۔ اس کے خطوط پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت اور آفت میں مبتلا ہے۔ احباب کی بے اعتنائی، اہلِ وطن

کی بے وفائی زمانے کی قدر ناشناسی، روحانی کوفت جسمانی آزار، قرضخواہوں کا تقاضائے زشت، مقدمات، اسیری، مفلسی کون سی آفت ہے جو اس کے سر پہ نازل نہ ہوئی ہو۔ اور کون سی بلا ہے جس نے اس غریب کا گھر نہ جھانکا ہو۔ لیکن وہ سب بلاؤں کو ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ مصیبت کا مقابلہ ظرافت سے کرتا ہے۔ یا حکمت اور تصوف سے تسکین حاصل کرتا ہے۔ زندگی کے مقابلے کے لیے حکمت اور روحانیت کے بعد سب سے کارگر ہتھیار ظرافت ہے۔ غالبؔ کو حالیؔ نے حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف کہا ہے اور بجا کہا ہے۔ ایک مطلع میں وہ اپنی طبیعت کا نقشہ کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ ظاہر حیات میں تو میرا رُواں رُواں گرفتاری میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن زندگی کے ظاہر کا ایک باطن بھی ہے اور قلب کے اندر ایسے محفوظ زاویے بھی ہیں جہاں نہ حکومت کا چیر ہے اور نہ انسانوں کی بیداد۔ بقول اقبال ؎

دل کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرنگی کا راج
دل کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

غالبؔ کا مطلع یہ ہے ؎

مرا دل ہست بہ پس کوچۂ گرفتاری
کشادہ روئے ترا زشاہدانِ بازاری

بعض گھروں کا ایک دروازہ بازار کی طرف کھلتا ہے جہاں کھلبلی اور شور ہوتا ہے اور دوسرا دروازہ عقب میں کسی خاموش بند گلی کی طرف ہوتا ہے۔ اگر سامنے کے دروازے سے کوئی تنگ کرنے والا شخص اندر آتا ہوا دکھائی دے اور انسان اس سے نہ ملنا چاہے تو پیچھے عقب کے چور دروازے سے کھسک جائے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ میری حالت کچھ اسی قسم کی ہے۔ پس کوچۂ گرفتاری میں میں نہایت بشاش، کشادہ رُو اور مطمئن ہوتا ہوں۔ بس اسی کوچے میں بیٹھ کر شگفتہ مضامین پیدا کرتا ہوں۔ دنیا میں



راہِ نجات یہی ہے کہ انسان کا دل پوری طرح دنیا کی گرفتاری میں پابند سلاسل نہ ہو جائے خود قلب کے اندر راہِ گریز بھی ہونی چاہیے۔

غالبؔ اشعار میں جا بجا اپنے باطن کی آگ کا ذکر کرتا ہے۔ آگ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے تحت الشعور میں کچھ تمنائیں سُلگ رہی ہیں۔ تمنا کی شدت کو عشق کہتے ہیں۔ اور عشق کو اکثر آگ ہی سے تشبیہ دی جاتی ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

عشق کا مفہوم واضح کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ عشق کی تقسیم مجازی اور حقیقی میں کی گئی ہے۔ لیکن یہ اجمال اس کی حقیقت پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتا۔ کوئی کہتا ہے کہ عشق حقیقی ہونا چاہیے مجازی عشق درست نہیں ؎

عشقِ حقیقی است مجازی مگیر
ایں دمِ شیر است بازی مگیر

دوسرا اس کے جواب میں یہ مقولہ پیش کرتا ہے کہ مجاز حقیقت کی طرف عبور کرنے کا پُل ہے۔ المجازُ قنطرۃ الحقیقۃ۔ پھر مجاز میں اس عشق سے جس کی بابت عارف رومیؒ کا فتویٰ ہے کہ (ع)

ایں فساد از خوردنِ گندم بود

زن و فرزند و احباب سے گھری محبت تک بہت سے اقسام اور مدارج ہیں۔ فطرت کے جمال کا عشق زندگی کے اقدار کا عشق، نوعِ انسان کی خیر طلبی کا عشق ان سب کے متعلق فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ مجاز کہاں ختم ہوتا اور حقیقت کہاں شروع ہوتی ہے۔ پھر یہ نفسیات بھی نہایت پیچیدہ ہے کہ عشق درد آفریں ہے یا لذت بخش یا کیا عشق میں درد و لذت یا سوز و ساز میں تمیز بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ کوئی شخص

عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ میں سے نکلنا نہیں چاہتا۔ عاشق اسے زندگی کا سرمایہ سمجھتا ہے۔ بقول اقبالؔ ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے — اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب — جل گئی مزرعِ ہستی تو اُگا دانۂ دل

عام لوگ نغمے کو اندوہ رُبا سمجھتے ہیں۔ غالبؔ ان کے متعلق کہتا ہے کہ انھیں کچھ نہ کہو یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں اور ایک پرانی روایت کو دہرا رہے ہیں۔ ورنہ اچھا نغمہ تو انسان کو اندوہگیں کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی روح دردناک موسیقی سے ایک خاص قسم کی لذّت حاصل کرتی ہے جو جسمانی لذّتوں سے بالکل الگ نوع کی کیفیّت ہے۔ اس تضاد سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ غالبؔ جو بار بار اپنی آتشِ درون کا ذکر کرتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ میں بیس کوچۂ گرفتاری میں ایک کشادہ رو دل رکھتا ہوں جو دنیوی غم والم سے نجات یافتہ ہے۔ اپنی اندرونی آگ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ باہر سے تو میں پانی کی ایک ندی دکھائی دیتا ہوں لیکن اگر کوئی اس میں غوطہ لگا کر مچھلی پکڑنا چاہے تو مچھلی کے بجائے اس کے ہاتھ میں آگ کا کیڑا یعنی سمندر آئے گا ؎

از بروں سو آبم امّا از دروں سو آتشم
ماہی ار جوئی سمندر یابی از دریائے من

اردو میں بھی غالبؔ کا ایک شعر سمندر کی بابت ہے ؎

ہمارے سینے میں ہے سوزِ آتشِ پنہاں
بروئے سُفرہ کباب دل سمندر کھینچ

میرا دل تار سے لٹکے ہوئے جرس کی طرح ہے۔ جب اس الٹے لٹکے ہوئے دل کو



جنبش ہوتی ہے تو اس میں سے نالہ نکلتا ہے ؎

چوں جرس کا نزا بتارے بستہ آویزاں کنند
نالہ می خیزد چو می جنبد دلِ درد آشنائے من

میرے کلام میں تمھیں روانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جانتے ہو یہ روانی کس چیز کی ہے؛ میں جو خونِ دل کھاتا ہوں وہ لبوں سے مسلسل ٹپکتا رہتا ہے ؎

اے کہ در نطقم روانی دیدۂ دانی کہ چیست
می خورم خونِ دل و می ریزد از لبہائے من

اس کے بعد وفورِ تمنّا کے ساتھ ساتھ خواہشوں کے پورا نہ ہونے اور زمانے کی طرف سے سدِّ باب و قطعِ اسباب کے متعلق ایک بلیغ تمثیل پیدا کی ہے۔ استسقا (ڈراپسی) کے مریض کو شدید پیاس لگی رہتی ہے۔ لیکن پانی پینا اس کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ جس قدر افزونیٔ عطش ہوتی ہے اسی قدر طبیب اس کے لیے پانی بند کر دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ کثرتِ تمنّا ہی نے مجھے نامراد بنایا ہے۔ خواہش کی شدت ہوتی ہے تو پانی کی بندش ہو جاتی ہے ؎

نامرادم دارد ایں افزونیٔ خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

اس کے آگے کہتا ہے کہ ادنیٰ سطح پہ مجازی عشق مجھ پہ غالب آکر میرے سارے نفس پہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ میری ساری بندگی اور تمام سجدے جذب کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خدا کی عبادت نہیں کر سکتا ؎

خاک کویش خود پسند افتادہ در جذبِ سجود
سجدۂ بر حرم نگذاشت در سیمائے من

---

SALEEM LIBRARY
I/S Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.



قصیدۂ ۶۴ کی ردیف 'نمی خواہم' ہے۔ پچاس سے زیادہ اشعار میں یہ بتلاتا ہے کہ میں کیا نہیں چاہتا۔ لیکن اس نہ 'چاہنے' سے لازماً یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں ؎

از نکوئی نشاں نمی خواہم
خویش را بدگماں نمی خواہم

میں نہیں چاہتا کہ اپنا ظاہری انداز اس قسم کا بنالوں کہ خواہ مخواہ نیک مشہور ہو جاؤں۔ جب اصلیت نہ ہو تو یہ ریا ہوگی۔ اور میں اپنے آپ سے بدگمان ہو جاؤں گا۔

؎ زیست بے ذوق مرگِ خوش نبود
دل اگر رفت جاں نمی خواہم

بے ذوق زندگی جس میں نہ ذوقِ جمال ہو اور نہ شوقِ کمال ایسی زندگی موت کے برابر ہے۔ اور ایسی موت بھی مرگِ خوش نہیں۔ دل میں لطیف جذبات اور پاکیزہ افکار ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا دل نہ رہے تو خالی جسمانی اور حیوانی زندگی کو باقی رکھ کر میں کیا کروں گا ؎

باغباں گرفت و خست و گزاشت
جز بباغ آشیاں نمی خواہم

باغباں نے مجھے پکڑا اور مجروح و خستہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ میرا آشیانہ باغ ہی میں ہو۔ تقدیر انسان کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کرے لیکن اس کے باوجود کوشش یہی ہونی چاہیے کہ زندگی اچھے ماحول میں بسر ہو

؎ دوستاں زینہار غم نخورند
شادیٔ دشمناں نمی خواہم

میں نہیں چاہتا کہ دوست میری ہمدردی اور غم خواری کیا کریں۔ اور میرے مصائب



پر آنسو بہائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو میرے دشمن خوش ہوں گے۔ میں اس ہمدردی کے مظاہرے سے دشمنوں کو خوش کرنا نہیں چاہتا۔ باوجود اس کے کہ کوئی شخص میرا فائدہ نہیں سوچتا میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا ؎

ہیچ کس سود من نمی خواہد
ہیچ کس را زیاں نمی خواہم

یہ نہ سمجھنا کہ اس مرکزِ خاک میں رہتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ آسمان کی گردش یا روشِ روزگار بدل جائے۔ تمنا عیب نہیں اور میں آرزوئیں رکھتا ہوں لیکن وہ اس قسم کی نہیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ صاحبدلوں کو رنج نہ پہنچے اور اہلِ زبان کاملوں کی زبان بندی نہ ہو۔ بوجھ اٹھانے والوں کے کندھے زخمی نہ ہوں اور کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادا جائے ؎

تا ندانی کہ من بمرکزِ خاک — جنبش از آسماں نمی خواہم
آرزو عیب نیست خرد بگیر — خواہم اما چناں نمی خواہم
رنجِ صاحبدلاں روا نبود — بندِ اہلِ زباں نمی خواہم
دوشہا را فگار نپسندم — بارہا را گراں نمی خواہم

غالب کے زمانے میں ہندوستان میں ابھی کوئی شخص اشتراکیت (سوشلزم) کا خواب نہ دیکھتا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کے سچے یا منافق ہمدرد ابھی اس سرزمین میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ سرمایہ داری اور بے مایگی کی کشمکش ابھی سطحِ شعور پر نہ آئی تھی۔ لیکن یہ انسانی جذبہ تو لطیف طبائع میں موجود تھا کہ حلال کی روزی کمانے والوں کی پشت گرانباری سے خم اور دوشِ مزدورِ مالا یطاق بوجھ سے مجروح نہ ہو۔ انسان کی یہ شکایت بھی ہزارہا برس کے معاشی اور معاشرتی ارتقا کے بعد ابھی تک رفع نہیں ہوئی کہ نااہل

جاہ و دولت و اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں اور عادل و عالم اور باکمال نفوس کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یا نفوسِ عالیہ کو نفوسِ سافلہ کے زیرِ نگیں کر دیا جاتا ہے۔ غیر منصفانہ معاشرت شاہین کو زاغ و زغن کے ماتحت کر دیتی ہے۔ (اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ) چیونٹی مارگیر بن جاتی ہے۔ اور مچھر ہاتھیوں کو ہانکنے لگتے ہیں۔ غرض اکثر اچھے لوگوں کو یہ احساس رہا کہ زمانہ ان سے انصاف نہیں کرتا۔ اور اس غیر منصفانہ معاشرت میں صاف باطن لوگوں کو راحت نصیب نہیں ہوتی۔ ان اشعار میں غالبؔ نے اسی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ایک منصفانہ معاشرت کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ جس میں انسان کھل کر آزادی سے اظہارِ خیال کر سکے۔ کام کاج کرنے والے لوگ ظالمانہ غلامی سے مجروح نہ ہوں۔ اور اعلیٰ درجے کے انسان ادنیٰ انسانوں کے زیرِ اقتدار نہ رہیں۔ لیکن اہلِ دل کے اندر ذاتی گرمئ حیات ہوتی ہے۔ اور یہ آتشِ دروں نارِ نمرود کی طرح ابراہیمی نفوس کے لیے گلزار آفریں بن جاتی ہے۔ ظاہر کے خارزاروں میں بھی یہ باطن کا گلزار گلریز رہتا ہے ؎

مور را مارگیر نپز یرم — پشہ را پیلباں نمی خواہم
بہرِ خویش از زمانۂ غدّار — راحتِ جاوداں نمی خواہم
آتش اندر نہادِ من زدہ اند — لالہ وارغواں نمی خواہم

گلزارِ باطن کے متعلق بیدلؔ کا کیا دل نشیں شعر ہے ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

---



# متفرق اشعار

انسانی زندگی نہ حصولِ عیش و لذّت کے لیے ہے اور نہ اس کا مقصد غم پروری ہے اقدارِ حیات کا تحقق، سیرت کی پاکیزگی و پختگی اور حقیقت اسی انسان کا نصب العین ہے یا ہونا چاہیے۔ جو نفوس کسی سعیِ بلیغ میں منہمک ہیں وہ زندگی کو لذّت و الم کے پیمانے سے نہیں ناپتے محض سکون اور اطمینان تو حشرات الارض کو انسان سے زیادہ حاصل ہے۔ رُوح کو لذّت اور الم دونوں کی گرفت سے آزاد رہنا چاہیے۔ یہ آنی جانی کیفیتیں ہیں جو ہر آن بدلتی رہتی ہیں۔ بقول حافظؔ

؎ بیار بادہ کہ ایّامِ غم نہ خواہد ماند
چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

اس مضمون کے لیے غالبؔ نے اچھی تشبیہ پیدا کی ہے۔ کہتا ہے کہ لذّت و الم کے بارے میں انسان کا دل چھلنی کی طرح ہونا چاہیے۔ خونابۂ اندوہ ہو یا بادۂ نشاط دونوں کو اس میں ٹھہرنا نہ چاہیے۔ جو چیز دل میں سمونی چاہیے اس کا تعلق کرب یا مسرّت سے نہیں۔ نہ بندۂ لذّت آزاد ہے، نہ گرفتارِ الم۔ اور جو نفس کوائفِ زندگی سے آزاد نہیں وہ حقیقی حریت سے ناآشنا ہے۔

؎ عیش و غم در دلِ نمی استد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما

چھلنی کا مضمون غالبؔ نے ایک رباعی میں بھی دلکش انداز سے باندھا ہے۔